زبان اور علم

(تحریر: ڈاکٹر محمد عثمان بٹ)

حال ہی میں مجھے ایک پرانے دوست سے ملنے کا اتفاق ہوا جو کسی وقت میرے ساتھ ایک نجی یونیورسٹی میں لیکچرار تھا۔ دورانِ ملازمت اسے اٹلی کی ایک یونیورسٹی سے ماسٹرز کی تعلیم کے لیے اسکالرشپ ملی اور وہ اٹلی چلا گیا۔ اس سے گفتگو کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ وہاں کے ماحول سے کچھ غیر مطمئن ہے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ موصوف کو اس بات پر اعتراض تھا کہ اٹلی کے لوگ ان کے ساتھ انگریزی میں بات کیوں نہیں کرتے۔ میرے عزیز دوست تو یہ سوچ کر آئے تھے کہ جیسے ہمارے ملک میں علمی قابلیت کا اندازا اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ ایک فرد کی انگریزی زبان پر کتنی دسترس ہے ویسے ہی وہاں بھی علم کا معیار انگریزی زبان ہی ہوگا، اور بڑے بڑے پروفیسر تو فر فر انگریزی بولتے ہوں گے لیکن یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ نکلا۔ یہاں آنے کہ بعد یہ حقیقت ان پر واضح ہونے لگی کہ زبان تو محض حصول علم کا ایک ذریعہ ہوتی ہے، اور یہ اپنی ذات میں کوئی علم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کی زیادہ توجہ علم کے حصول پر ہے نہ کہ ان ذرائع پر (جیسا کہ غیر ملکی زبانیں) جن سے علم حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال میرے عزیز دوست اس حقیقت سے اس قدر دلبرداشت ہوئے کہ واپس لوٹ آئے۔

مجھے انتہائی دکھ اور کرب محسوس ھوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں عمومی طور پر کچھ اسی طرح کی سوچ رائج ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ سوچ زور پکڑتی جا رہی ہے۔ انگریزی میں مہارت سے کسی کی علمی قابلیت کا اندازہ لگانا دراصل احساس کمتری کی ایک بدترین شکل ھے۔ اس طرح کا معیار قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ لاشعوری طور پر اس بات کو تسلیم کر چکے کہ آپ ذہنی اعتبار سے ایک حقیر مخلوق ہیں اور علم کو تخلیق کرنے کی قابلیت شاید آپ میں ہے ہی نہیں، اور پھر یہ کہ حقیقی علم کے لیے آپ

ہمیشہ دوسروں کے محتاج رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے ذہین ترین لوگوں کی اکثریت اپنی ذہانت کا کثیر حصہ اپنی انگریزی کو درجہ کمال تک پہچانے میں خرچ کر دیتی ہے۔ وہ اذہان جنھیں سائنس میں نئی نئی دریافتیں کرنا چاہئیں، لامحدود کائنات کے مخفی رازوں سے پردہ اٹھا کر اس کی تسخیر کرنا چاہیے، ان کی ساری توجہ انگریزی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے پر مرکوز ہے۔ اس طرح کے ماحول میں تربیت پانے والے نوجوان بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو کر احسن انداز میں اپنے آقاؤں کی چاکری تو کر سکتے ہیں لیکن ایسے میں کسی گیلیلیو، مائیکل فیراڈے، آئن اسٹائن یا ہیگل کے پیدا ہونے کی کوئی اُمید نہیں رکھی جا سکتی۔

کائنات کے درست تصور کی دریافت سے لے کر ایٹم کے رازوں تک رسائی تک کے تمام واقعات جنھوں نے انسانیت پر انتہائی دوررس اور انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ان معاشروں میں وقوع پزیر ہوئے جہاں علم اور تحقیق توجہ کا مرکز رہے اور تحقیق اور تفکر کا یہ عمل ظاہر ہے کہ ان کی علاقائی زبانوں میں ہوتا تھا۔ گلوانی، وولٹا اور شمروک جنھوں نے ساکن برقیات (static electricity) پر اپنے تجربات کے ذریعے بجلی (موجودہ شکل) کی دریافت کا راستہ ہموار کیا انگریزی کے ایک شبد سے بھی واقف نہ تھے۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ آج کی جدید دنیا کا تصور بھی ان ذہین لوگوں کی ایجادات کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ مواصلات کی دنیا میں انقلاب برپا کرنے والی برقی مقناطیسی شعائیں (electromagnetic waves) کا سہرا جو کہ دو سائنسدانوں اسکاٹ لینڈ کے میکسویل اور جرمنی کے ہرٹز کے سر ہے، ظاہر ہے کہ انگریزی زبان کے ماہر نہیں تھے۔ فرانسیسی بولنے والے ایک سائنسدان انٹونیو لیوائزر نے آکسیجن گیس دریافت کی، جس کی اہمیت سے آج ہر شخص واقف ہے۔ ہماری زمین پر حیات کی ضامن یہی آکسیجن گیس ہے۔

حرحرکیات (Thermodynamics) کے قوانین، ایٹمی توانائی، نظریہ اضافت اور اس طرح کی لاتعداد دریافتیں جنھوں نے آج کی دنیا کو یہ جدید شکل دی، انگریزی زبان کی مرہونِ منت نہیں بلکہ تجسس اور تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے لیکن صرف وہی معاشرے خودمختار اور باوقار ہیں جو تحقیقِ علم میں سب سے آگے ہیں۔ صرف انگریزی زبان کی پرستش کرنے والی قومیں علم کے خالقوں کی ہر سطح پر محتاج ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہماری ترجیحات کیا ہیں؟ کیا ہم اپنی اس روش کو برقرار رکھتے ہوئے احساس کمتری کی اس دلدل میں مزید دھنسنا چاہتے ہیں یا پھر تحقیق اور علم کو ترجیح دے کر انسانیت پر اپنے مثبت اثرات چھوڑنا چاہتے ہیں؟ فیصلہ آپ خود کیجیے!

ڈاکٹر محمد عثمان بٹ، جرمنی کی University of Cottbus سے ہوائی حرکیات (aerodynamics) میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یونیورسٹی آف لاہور میں میکینکل انجینئرنگ کے شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ آپ وزٹنگ سائنٹسٹ (visiting Scientist) کی حیثیت سے یونیورسٹی آف راسٹاک (Rostock) سے بھی وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ آپ Siemens اور EADS کے لئے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔